بے جی

بے جی چودہ سال کی تھیں جب بیاہ کر نئے گھر میں آئیں۔ایک رات پہلے ہی ایک اور اندھیرے کمرے میں بیٹھیں تھیں اور آج ایک دوسرے اندھیرے کمرے میں ایک بھاری سا دوپٹہ سر پر لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ان کی اس تبدیلی کا محور کونے میں رکھا ایک جلتا بجھتا دِیا تھا جس کی لو نے سارے کمرے میں بھونچال بپا کر رکھا تھا۔

اندھیرے سے رشتہ پرانا تھا۔ماں پیدا کرتے ہی قبر کے اندھیروں میں گم ہو گئی۔گودیاں بدلتے بچپن بیتا۔جس نے شیر دیا صبر وشکر کر کے پی لیا۔چلنے لگیں تو کسی نے جھاڑو تھما دیا۔ہاتھ میں آٹے کا پیڑا اٹھانے کی سکت آئی تو چولہے پر ہاتھ جلنے لگے۔پتھر کی چکی سے گیہوں کو خاک کیا۔بزور بازو دودھ کو مکھن میں بدلا۔جہاں سے پیار ملا سمیٹ لیا، جہاں سے مار ملی قبول کی۔لیکن ان کا چھوٹا سا اندھیرا کمرہ ان کا ساتھی رہا۔ایک دن ان کے کمرے میں کچھ عورتیں آئیں اور کپڑے بدلوا کر اور کچھ تھوپ تھاپ کر چلی گئیں۔مولوی صاحب آئے اور کچھ پوچھ کر چلے گئے۔پھر سب نے مل کر ان کو اندھیرے کمرے سے نکالا اور ڈولی میں بٹھا دیا۔ڈولی کہیں چل دی

اور چار کندھوں پر سوار بے جی بھی کہیں پہنچ گئیں۔ ڈولی سے کسی نے نکال کر ایک اور اندھیرے کمرے میں بٹھا دیا۔

بے جی اپنے اندھیرے سے تو آشنا تھیں لیکن اس نئے اندھیرے کا مطلب ان کے چودہ سال پر محیط چھوٹے سے پردے پر موجود نہیں تھا۔ کبھی اپنے ہاتھوں کو گھورتیں تو کبھی دیے کی لُو کو۔ پھر کوئی کمرے میں داخل ہوا اور دیا بجھ گیا۔

ابھی بے جی اس نئی دنیا کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھیں کہ چپکے سے کسی نے ان کے پہلو میں ان کی بیٹی سلا دی۔ ان کے ہاتھوں اور ان کی بیٹی کے ہاتھوں میں کوئی زیادہ فرق تھا نہیں۔ لیکن وہ ان کی بیٹی تھی۔ جینے کی وجہ مل گئی۔ جس مکان میں سال بھر سے آباد تھیں، اسے چولہے چمٹے سے پہلی بار نکل کر دیکھا۔ دو سادہ سے کمرے، کمروں کے سامنے برآمدہ، اور برآمدے کے سامنے میلوں پر پھیلا صحن، جس کی حد پر برگد کا ایک بھاری بھرکم درخت۔ وہ کبھی اس کائنات کو دیکھتیں تو کبھی اپنے چھوٹے سے ہاتھوں کو۔ اس مکان کو گھر کیسے بناؤں؟ اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس نے چمکتی آنکھوں اور میٹھی مسکان سے کچھ کہا۔ تہیہ کر لیا۔ 15 سال کی عمر کا تہیہ زندگی بھر کی کہانی بن گیا۔ بیٹی کو اپنی بانہوں میں اٹھایا اور جیسے پہلی بار اندھیرے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر سانس لی۔ برگد کی گھنی چھاؤں میں جا بیٹھیں اور ماں بن گئیں۔

بے جی کے وقتوں میں زندگی سیدھی سادی تھی۔ بس چار وقوف تھے۔ باپ کا گھر، خاوند کا گھر، زندگی رہی تو بیٹے کا گھر اور پھر آخری اور اصلی گھر۔ یہ رستہ صرف ایک ہی سمت میں جاتا تھا۔ اس پر واپسی کا کوئی رستہ نہ تھا۔ میاں بیوی کا ایک چارپائی

پرسب کے سامنے بیٹھنا معیوب جانا جاتا۔ زندگی اور موت کا زائچہ اردگرد رونما ہونے والے واقعات جیسے زلزلہ، جنگ یا وبا کے ساتھ منسلک رہتا۔ سورج ہی واحد گھڑی تھی۔ اس کے طلوع کے ساتھ ہی زندگی رواں دواں ہو جاتی اور غروب ہوتے ہی خاموشی سے اپنے اپنے اندھیروں میں روپوش ہو جاتی۔ ملا کی آذان سب کو وقت سے باندھ کر رکھتی۔

چولہا جلتا رہا، جھاڑو چلتا رہا۔ بے جی اَب محلے کی دوسری بچیوں سے کچھ بڑی ہوگئیں۔ نیک تو تھیں ہی۔ قرآن بھی پڑھ لیتی تھیں اور نماز بھی۔ انہیں ''پکی روٹی'' بھی پوری یاد تھی۔ محلے میں ان کی کافی عزت تھی۔ بیٹی کے بعد دو بچے اور ہوئے اور دامن بھر گیا۔ جب آپ کی پارسائی کی مہک پھیلنے لگی تو محلے کی عورتیں بے جی کے پاس اپنی بیٹیوں کو قرآن پڑھنے بھیجنے لگیں۔ رونق بھی لگ گئی، برکت بھی ہوگئی اور آسرا بھی بن گیا۔ بے جی اَب پورے بیس برس کی ہوگئیں اور معتبر بھی۔ قرآن پڑھنے والی بچیوں نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا اور ان کے والدین نے باہر کا۔ پھر اللہ نے بے جی کو حکمت بھی عطا کر دی۔ گوبر کی راکھ میں کالا نمک ملا کر گلوں کا مکمل علاج کر دیتیں۔ ہلدی ملا ابلا ہوا دودھ ہر درد کی دوا ٹھہرتا۔ جامن سے شوگر کا علاج کر دیتیں تو کوڑی گھٹی سے پھنسیوں کا۔ ان کے پاس روزمرہ کی ہر بیماری کا روزمرہ علاج موجود تھا۔ لوگوں کو ان پر یقین تھا۔ بہت سے تو ان کے ''چھو'' سے ہی ٹھیک ہو جاتے۔ ہاں ایک نسخہ ان کے پاس ایسا تھا جس کا توڑ کسی کے پاس نہیں تھا۔ کھٹی میٹھی ٹافیوں کا ایک بھرا ہوا ڈبا ان کی اندر والی الماری کے اوپر والے خانے میں دھرا رہتا۔

سب کو معلوم تھا لیکن کوئی چراتا نہیں تھا۔ بے جی بچوں کی آنکھیں پڑھ لیتی تھیں۔ اس سے پہلے کہ طلب ہوتی، کھٹی میٹھی گولی ہاتھ میں موجود ہوتی۔ وہ بچوں کی بے جی تھیں۔

بے جی اَب پچیس برس کی ہو گئیں تو فیض بھی بڑھ گیا۔ اَب وہ محلے کے ہر جانے والے کو سورۃ یٰسین سے وداع کرتیں اور ہر آنے والے کو شہد چٹوا کر خوش آمدید کہتیں۔ محلّہ ان کی راج دہانی بن گیا۔ ہر کوئی یا تو ان کے قرآن سے فیض یاب تھا، یا ان کے علاج سے۔ کوئی منہ بولا بھائی تھا تو کوئی منہ بولا بیٹا۔ بیٹیاں تو سب ہی سانجھی تھیں۔ بچے بھی خود ہی بڑے ہونے لگے اور گھر کے مرد کا خیال بھی بھرپور رکھا جانے لگا۔ ان کا اَب کوئی کمرہ بھی اندھیرا نہ تھا۔ برآمدے میں پینگ ڈل گئی، برگد کے درخت پر پینگیں۔ رشتے داروں کے بچے بھی اسی گھر کا رخ کرتے۔ ٹافی بھی ملتی، پیار بھی اور بے روک ٹوک کھلا صحن بھی۔ بچے توجہ چاہتے ہیں، پیار سے بھی زیادہ۔ بے جی کو یہ راز ہمیشہ سے معلوم تھا۔ بے جی کے بچپن میں کسی نے ان کی نہیں سنی تو خاموش رہتی تھیں۔ اس کا بدلہ انہوں نے جوانی میں لیا۔ خوب بولتیں، قصے، بکھیڑے، قہقہے محفل کو گلزار کر دیتے۔ ان کی باتیں معصوم اور بے ضرر ہوتیں۔ انگریزی کے کل ملا کر چار یا پانچ لفظ ان کو یاد تھے۔ ہاں ان الفاظ کی ہر ہڈی توڑنے پر انہیں عبور حاصل تھا۔ اور وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے بھی نہ دیتیں۔ بولتی جاتیں اور مسکراتی جاتیں۔ اصل میں وہ کبھی بڑی ہوئی نہیں۔ عمر ڈھلتی گئی اور وہ معصوم ہوتی گئیں۔

پھر ایک دن بڑی بیٹی کو وداع کرنے کا دن آ گیا۔ جھٹ سے یادوں کی پیٹی میں سے اپنے اندھیرے سے کمرے کو نکالا اور جھاڑ پونچھ کر اس میں جا بیٹھیں۔ وہ

صرف ان کی بیٹی نہیں تھی۔ وہ تو ان کی پتوار تھی جس سے وہ اپنی زندگی کی کشتی کو ہر مدوجزر سے نکال لیتی تھیں۔ پھر اللہ کی رضا جان کر لبیک کہا اور اپنی رانی کو وداع کر دیا۔ بہت خوش تھیں کہ ان کی بیٹی ایک بھرے پرے گھر میں جا رہی تھی جہاں کمرے روشن تھے۔ بہن چلی گئی تو بچوں میں دل لگا لیا۔

پھر ایک دن خبر آئی کہ ان کی بیٹی اپنے حصے کا انسان دنیا کو سونپ کر چلی گئی۔ بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ بتائے۔ سارے نسخے اور سارے ''چھو'' دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ جس کا ہاتھ پکڑ کر چلنا سیکھا تھا، جس کی مسکان سے مسکرانا اور رونے سے دکھ کو سمجھا تھا وہ اپنے جیسا روتا تھرکتا انسان ان کو دے کر چلی گئی اور بے جی پینتیس سے پچاس کی ہو گئیں۔ بہت عرصہ لگا ان کو اپنے آپ کو یقین دلوانے میں۔ لیکن انہوں نے دل سے اس حقیقت کو کبھی قبول نہیں کیا۔

بچے بڑے اور پھر بہت بڑے ہو گئے۔ گھر کے مرد جیسی خاموشی سے زندگی میں آئے تھے۔ اسی خاموشی سے ایک دن چلے گئے۔ بے جی نے ان کے بارے میں کبھی گلا نہیں کیا۔ بچے بڑے ہو گئے تو صحن چھوٹا ہو گیا۔ قرآن کی تلاوت شور بن گئی، پینگوں کے لوہے کو زنگ لگ گیا۔ اور پھر جب تنخواہ، پنشن میں بدلی تو ٹافیوں کے ڈبے پر بھی سوال اٹھنے لگے۔ بیٹی اپنے گھر کی ہوئی اور بیٹا بہو بیاہ لایا۔

بادشاہت صدا رہتی نہیں اور نہ ہی کوئی اس کا بٹوارہ قبول کرتا ہے۔ معاشی اور معاشرتی اقدار کے زاویے بدلے تو اقتدار کی جنگ بھی شروع ہو گئی۔ بے جی نے پیچھے ہٹ جانے میں ہی آفیت جانی اور زندگی کو ان نئی جہتوں کے بہاؤ کے ساتھ بہنے

دیا۔ بہت خوب فیصلہ تھا۔ فتح پانے والے لشکر کو قلعے کی چابیاں خوش اسلوبی سے سونپ دینے پر عام معافی کے امکانات بہت روشن ہوتے ہیں۔ کچھ بے جی بھی خوش قسمت تھیں۔ انہیں کوئی پیچیدہ جنگ لڑنی بھی نہیں پڑی۔ وہ آرام سے ''باہر والی منجی'' سے ''اندر والی منجی'' پر منتقل ہو گئیں۔

بے جی کو ہمیشہ سے زر سے زیادہ سود سے محبت تھی۔ وہ اپنے چار بھائیوں کی بڑی بہن تھیں۔ خوب حق جتاتیں، گلے کرتیں، شکایتیں لگاتیں اور من مانی بھی کرتیں۔ لیکن ان بھائیوں کے بچوں کے ساتھ ان کا رشتہ آفاقی تھا۔ انہوں نے تمام زندگی یہ روحانی رشتہ خوب نبھایا۔

وقت بیت گیا۔ بے جی نے اَب ڈاکٹروں سے لو لگا لی۔ زندگی کے آخری سال مشکل سے گزرے۔ بیماری اور محتاجی نے بہت رگیڑا۔ کچھ اچھا کیا کام آیا تو اولاد نے اپنا حق خوب نبھایا۔

پھر ایک دن وقت وداع آ گیا۔ آنکھیں موندیں تو دو اندھیرے کمروں سے اجالوں اور پھر بڑھاپے کے اندھیروں تک کا سفر آنکھوں کے سامنے تیر گیا۔ دل میں سوچا کہ یہ کہانی تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ختم کیسے ہو گئی۔ اور پھر قرآن پڑھتی بچیاں آئیں اور بے جی کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ اللہ ان کے آخری کمرے کو اپنے نور سے منور فرمائے۔ آمین